

نفاذ شریعت

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جمہوریت اسلام کے لیے ایک اجنبی تصور ہے۔ حکومت قائم کرنے کا مثالی طریقہ اسلام کی رو سے وہی ہے جو طالبان نے افغانستان میں ملائیم کی حکومت قائم کرنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ آئین، پارلیمان اور انتخابات، یہ سب دور جدید کے خرافات ہیں۔ اسلام اپنے نفاذ کے لیے ان میں سے کسی چیز کا پابند نہیں ہے۔ اُس کی جو تعبیر فقہ حنفی میں ہو چکی ہے، ہمارے لیے وہی حتمی ہے۔ فقہاء کے اجتہادات بھی مدون ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی سے متعلق فقہاء نے اپنے فیصلے مرتب کر دیے ہیں۔ یہ سب قرآن، سنت، اجماع اور قیاس کی بنیاد پر مرتب کیے گئے ہیں اور فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ انھیں نافذ ہونا چاہیے۔ اس کے لیے کسی پارلیمان سے منظوری حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا جو طریقہ یہ حضرات تجویز کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ریاست کے تمام اداروں پر عدلیہ کی بالادستی قائم ہو اور عدلیہ علما کے حوالے کر دی جائے، اس لیے کہ اسلامی شریعت کے ماہرین وہی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ گزشتہ بارہ صدیوں کی تاریخ اُن کی پشت پر ہے۔ سلطنت عباسیہ کے قاضی القضاة (Chief Justice) کی حیثیت سے امام ابو یوسف کے تقرر کے بعد ہر جگہ یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ اسے مغربی استعمار نے ختم کیا تھا۔ مسلمان اب آزاد ہیں، لہذا نظم ریاست کو شریعت کے مطابق چلانے کا یہ طریقہ بھی بحال ہونا چاہیے۔

اسلام کو جو کچھ میں نے سمجھا ہے، اُس کی بنا پر پورے اطمینان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ قرآن اس نقطہ نظر کو قبول نہیں کرتا۔ نظم ریاست کو چلانے کا جو طریقہ اُس نے بتایا ہے، وہ جمہوریت ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے: اَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ، ”مسلمانوں کے معاملات اُن کے باہمی مشورے سے چلائے جاتے ہیں۔“ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اسی کی وضاحت میں فرمایا ہے: ”جس نے مسلمانوں کی رائے کے بغیر کسی کی بیعت کی، وہ اپنے آپ کو قتل کے لیے پیش

کرے گا۔‘ ہماری تاریخ میں اس مقصد سے بادشاہت کا طریقہ بھی اختیار کیا گیا ہے اور آمریت کا بھی اور ہمارے بعض گروہ اس بات کے بھی قائل رہے ہیں کہ حکومت کے سربراہ کو خدا کا مامور ہونا چاہیے، لیکن نظم ریاست کو چلانے کے لیے قرآن کا مقرر کردہ قاعدہ یہی ہے۔ اپنی نوعیت اور فطرت کے لحاظ سے یہ قاعدہ جن چیزوں کا تقاضا کرتا ہے، دور حاضر کے ایک جلیل القدر عالم مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اپنی تفسیر میں بیان فرمائی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”اول یہ کہ اجتماعی معاملات جن لوگوں کے حقوق اور مفاد سے تعلق رکھتے ہیں، انہیں اظہار رائے کی پوری آزادی حاصل ہو اور وہ اس بات سے پوری طرح باخبر رکھے جائیں کہ ان کے معاملات فی الواقع کس طرح چلائے جا رہے ہیں اور انہیں اس امر کا بھی پورا حق حاصل ہو کہ اگر وہ اپنے معاملات کی سربراہی میں کوئی غلطی یا خامی یا کوتاہی دیکھیں تو اس پر ٹوک سکیں، احتجاج کر سکیں اور اصلاح ہوتی نہ دیکھیں تو سربراہ کاروں کو بدل سکیں۔ لوگوں کا منہ بند کر کے اور ان کے ہاتھ پاؤں کس کر اور ان کو بے خبر کر کے ان کے اجتماعی معاملات چلانا صریح بددیانتی ہے، جسے کوئی شخص بھی اَمْرُہُمْ شُورَیْ یَبْنِہُمْ کے اصول کی پیروی نہیں مان سکتا۔

دوم یہ کہ اجتماعی معاملات کو چلانے کی ذمہ داری جس شخص پر بھی ڈالنی ہو، اسے لوگوں کی رضامندی سے مقرر کیا جائے اور یہ رضامندی ان کی آزادانہ رضامندی ہو۔ جبر اور تخویف سے حاصل کی ہوئی یا تحریص و اطماع سے خریدی ہوئی یا دھوکے اور فریب اور مکاریوں سے کھسوٹی ہوئی رضامندی، درحقیقت رضامندی نہیں ہے۔ ایک قوم کا صحیح سربراہ وہ نہیں ہوتا جو ہر ممکن طریقے سے کوشش کر کے اس کا سربراہ بنے، بلکہ وہ ہوتا ہے جس کو لوگ اپنی خوشی اور پسند سے اپنا سربراہ بنائیں۔

سوم یہ کہ سربراہ کار کو مشورہ دینے کے لیے بھی وہ لوگ مقرر کیے جائیں جن کو قوم کا اعتماد حاصل ہو اور ظاہر بات ہے کہ ایسے لوگ کبھی صحیح معنوں میں حقیقی اعتماد کے حامل قرار نہیں دیے جاسکتے جو دباؤ ڈال کر یا مال سے خرید کر یا جھوٹ اور مکر سے کام لے کر یا لوگوں کو گمراہ کر کے نمائندگی کا مقام حاصل کریں۔

چہارم یہ کہ مشورہ دینے والے اپنے علم اور ایمان و ضمیر کے مطابق رائے دیں اور اس طرح کے اظہار رائے کی انہیں پوری آزادی حاصل ہو۔ یہ بات جہاں نہ ہو، جہاں مشورہ دینے والے کسی لالچ یا خوف کی بنا پر یا کسی جھٹھا بندی میں کسے ہوئے ہونے کی وجہ سے خود اپنے علم اور ضمیر کے خلاف رائے دیں، وہاں درحقیقت خیانت اور

عداری ہوگی، نہ کہ اَمْرُهُمْ شُورَی بَيْنَهُمْ کی پیروی۔

پنجم یہ کہ جو مشورہ اہل شوری کے اجماع (اتفاق رائے) سے دیا جائے یا جسے اُن کے جمہور (اکثریت) کی تائید حاصل ہو، اُسے تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اگر ایک شخص یا ایک ٹولہ سب کی سننے کے بعد اپنی من مانی کرنے کا مختار ہو تو مشاورت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہا ہے کہ: ”اُن کے معاملات میں اُن سے مشورہ لیا جاتا ہے“ بلکہ یہ فرما رہا ہے کہ: ”اُن کے معاملات آپس کے مشورے سے چلتے ہیں۔“ اس ارشاد کی تعمیل محض مشورہ لے لینے سے نہیں ہو جاتی، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ مشاورت میں اجماع یا اکثریت کے ساتھ جو بات طے ہو، اُسی کے مطابق معاملات چلیں۔“ (تفہیم القرآن ۵۰۹/۴)

اس سے واضح ہے کہ ریاست سے متعلق دین نے بھی کوئی حکم اگر دیا ہے تو اُس کی تعبیر و تشریح کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ دینی علوم کے ماہرین اپنی اپنی تشریحات پیش کر سکتے ہیں۔ اُن کا حق ہے کہ اپنے موقف کا اظہار کریں، مگر اُن کے اس موقف کو لوگوں کے لیے واجب الاطاعت قانون کی حیثیت اُسی وقت حاصل ہوگی، جب اُن کے منتخب نمائندوں کی اکثریت اُسے قبول کر لے گی۔ جدید ریاست میں پارلیمان کا ادارہ اسی مقصد سے قائم کیا جاتا ہے۔ ریاست کے نظام میں آخری فیصلہ اُسی کا ہے اور اُسی کا ہونا چاہیے۔ لوگوں کا حق ہے کہ پارلیمان کے فیصلوں پر تنقید کریں اور اُن کی غلطی واضح کرنے کی کوشش کرتے رہیں، لیکن اُن کی خلاف ورزی اور اُن سے بغاوت کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ علما ہوں یا ریاست کی عدلیہ، پارلیمان سے کوئی بالاتر نہیں ہو سکتا۔ ہر ادارہ پابند ہے کہ اُس کے فیصلوں سے اختلاف کے باوجود عملاً اُن کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔

پارلیمان کی یہ حیثیت تسلیم کر لی جائے تو ”اسلامی ریاست“ اور ”سیکولر ریاست“ کی تعبیرات بھی غیر متعلق ہو جاتی ہیں۔ اس طرح کی چیزیں شخصی حکومتوں کے لیے ضروری تھیں۔ ہماری جدوجہد کا محور ایک خالص جمہوری ریاست ہونا چاہیے۔ یہ ریاست اگر ایک مرتبہ قائم ہو جائے تو لوگ جتنے مسلمان ہوں گے، اسلام اُسی کے بقدر اُن کی ریاست کے نظام میں ظہور پذیر ہو جائے گا۔ اس کا فطری طریقہ یہی ہے۔ اس سے ہٹ کر جو کچھ کیا جائے گا، اُس کا نتیجہ منافقت ہوگی جس کا تجربہ ہم گزشتہ نصف صدی سے پاکستان میں کر رہے ہیں۔

علما اور مصلحین کا اصلی کام یہ ہے کہ تعلیم و تعلم کے ذریعے سے وہ عوام و خواص کے اذہان اس کے لیے تیار کریں۔ انھیں حکمت کے ساتھ اور موعظہ حسنہ کے اسلوب میں اس کی دعوت دیں، اُن کے سوالات کا سامنا

کریں، اُن کے اشکالات دور کریں اور دلائل کے ساتھ اُنھیں بتائیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت کیوں دی ہے؟ اجتماعی زندگی کے ساتھ اُس کا کیا تعلق ہے؟ اُس میں احکام کی بنیاد کیا ہے اور دور حاضر کا انسان اُس کو سمجھنے میں دقت کیوں محسوس کرتا ہے؟ اُس کی تفہیم و تبیین کے لیے ایسے اسالیب اختیار کریں جن سے اُس کی حکمت، معنویت اور اُس کے مقاصد لوگوں پر واضح ہوں اور اُن کے دل و دماغ پورے اطمینان کے ساتھ اُسے قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ قرآن میں اُن کا منصب دعوت و انداز قرار دیا گیا ہے، وہ اپنی قوم کے لیے داروغہ نہیں بنائے گئے کہ اپنے پیروکاروں کے جتنے منظم کر کے بندوق کے زور پر اُسے شریعت کا پابند بنانے کی کوشش کریں۔ علما تو ایک طرف، ریاست کا نظم اجتماعی بھی نماز اور زکوٰۃ کے سوادین کے ایجابی تقاضوں میں سے کوئی چیز لوگوں پر قانون کی طاقت سے نافذ نہیں کر سکتا۔ قرآن اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ آخرت میں جواب دہی کے لحاظ سے اسلام کے مطالبات اپنے ماننے والوں سے خواہ کچھ ہوں، اُن کی ریاست جو مطالبات اُن سے کر سکتی ہے، وہ یہی ہیں۔ ان کے علاوہ یہ صرف تبلیغ و تلقین اور تعلیم و تدریس ہے جس کے ذریعے اُن کی اصلاح کی جدوجہد کی جاسکتی ہے۔ علما اگر سیاست سے دل چسپی رکھتے ہوں تو سیاسی جماعتیں موجود ہیں، وہ اُن میں شامل ہو کر پارلیمنٹ میں پہنچ سکتے اور قانون سازی کے لیے مقرر کردہ طریقوں کے مطابق قانون کی اسلامی تشکیل کے لیے اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔